

فطانت اور اس کی استمرانیاں

پروفیسر عبد الحمید صدیقی ایم اے

دنیا نے انسانیت کو حجب وہ امن و اطمینان، جس کے سنہرے خواب وہ تہذیب الحاد کے سائے میں دیکھ رہی تھی، نہ سرمایہ دارانہ جمہوریت سے ملا، نہ اشتراکیت کی تحریک سے، تو ایک تیسری تحریک اسی تہذیب کے بطن سے نمودار ہوئی، جسے عام طور پر فاشیزم یا فسطائیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ تحریک بظاہر سرمایہ دارانہ جمہوریت اور سوشلزم کے مجموعی رد عمل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، مگر گہری نظر سے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت از خود منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ اپنے مزاج اور اساسی تصورات کے اعتبار سے بالکل اپنے پیشتر تمام بھائیوں سے ملتی جلتی ہے۔ ان کی پھیلائی ہوئی بدعتیں بدلے ہوئے ناموں سے اس میں موجود ہیں۔

مغربی انسان کی یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ الحاد اس کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنی فطرت سے باہر نہیں جاسکتا، اس کی حدود و قیود نہیں توڑ سکتا، اسی طرح یورپ کے زرخیز دماغ الحاد کو جو کئی سو سالوں سے اُن میں جاگزیں ہے نہیں چھوڑ سکتے۔ اُن کے دلوں میں مختلف نظاموں کے متعلق برابر شکوک و شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ نئی نئی تحقیقات سے ان کی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے بھی برابر جدوجہد کرتے ہیں مگر نظام فکر کا جو ڈھانچہ ملے، وہ تعبیر کرتے ہیں اُن میں الحاد ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل ہو جاتا ہے۔ اُن کی حالت تقس کی سی ہے، جو آخری عمر کو پہنچ کر اپنے گھونسلے میں آگ لگا کر جل مڑتا ہے، مگر پھر راکھ میں سے وہی پہلی قسم کی زندگی پیدا کرتا ہے۔ مغربی مفکرین بھی خود فکر و تلاش و جستجو کے بعد اپنے افکار کے آشیالوں کو اپنے ہی نغمہ ہائے آتشیں سے پھونک ڈالتے ہیں، مگر پھر ان کی خاکستر سے ویسی ہی زندگی پیدا کرتے ہیں، جس کی تلخیدوں نے انہیں آشیالی سوزی پر مجبور کیا تھا۔ یہی وجہ ہے

کہ جن مفاسد سے بچنے کے لیے وہ نظام حیات کا ڈھانچہ بدلتے ہیں وہی برائیاں تبدیل شدہ شکل میں اُن کے سامنے جلد ہی رونما ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

سرمایہ داری، انٹر اکیٹ، اور فسطائیت ایک ہی سلسلہ کی تین کڑیاں ہیں۔ جن برائیوں سے انسانیت کو محفوظ کرنے کے لیے یورپی مفکرین نے ایک طرف آزاد معیشت، اور دوسری طرف اشتراکی جبر بند یوں سے بچانے کا اہتمام کیا، اور اسی اہتمام کے تحت فسطائیت کی راہ اہل یورپ کو سمجھائی، وہ ساری برائیاں خود فسطائیت میں بھی اُبھر کے رہیں۔ انسانیت کا قافلہ اس نئی شاہراہ پر ابھی چند قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ ایسے معلوم ہو گیا کہ وہ بربریت کے ایسے مہیب غاروں کی طرف لڑھک رہا ہے جہاں صلح، امن، اور سلامتی بے اثر مفقود ہیں اور جہاں قانون، اخلاق، انصاف بالکل بے معنی الفاظ ہیں۔ اور جہاں نظم و اتحاد کی بجائے افتراق و تباہی کی فرمانروائی ہے۔ فاشنزم کا یہ عظیم الشان درخت جس سرسنت کے ساتھ بلند ہوا جس برق زقاری کے ساتھ اس کی شاخیں سارے عالم میں پھیلیں وہ سطح بین الحکموں کو متحیر کرنے کے لیے کافی ہے مگر بار آور ہونے کے بعد جب انسانیت نے اس کے پھلوں کو چکچکا تو اس وقت یہ حقیقت اس پر آشکارا ہوئی کہ اس کے ثمرات صرف تلخ ہی نہیں بلکہ جان لیوا بھی ہیں۔

فاشنزم کے متعلق یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ یہ ان مخصوص نظاموں کے کسی ڈھانچے کا نام نہیں جو ہٹلر نے جرمنی میں یا مسولینی نے اٹلی میں قائم کیے۔ بلکہ فسطائیت کے پچھرا ساسی تصورات ہیں۔ اس کے کچھ واضح اور نگے بندھے اصول ہیں، اس کا اپنا ایک نظام عمل ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے فاشنزم کا کوئی ڈھانچہ تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔ یورپ کی مختلف فسطائی جماعتوں کے پروگرام خواہ بظاہر ایک دوسرے سے کتنے الگ اور بعض اوقات مختلف ہی کیوں نہ ہوں، مگر غور سے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ ان کی تہ میں ایک ہی محرک، ایک ہی زامیہ نگاہ اور ایک ہی طرز فکر کارفرما ہے۔ فاشنزم کو خواہ جرمنی اور اٹلی میں فرمانروائی کا موقع ملے، یا اس کا علم جنوبی امریکہ، ترکی، یوگوسلاویہ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، پولینڈ یا کسی دوسرے ملک میں بلند ہو۔ یہ نظام اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک ہی ہو گا اور اس سے ان ممالک میں ایک ہی طرح کے نتائج برآمد ہونگے۔ ہٹلر اور مسولینی دونوں

نے اس بات کو صرف محسوس اور تسلیم کیا، بلکہ انہوں نے اسے پوری شد و مد کے ساتھ دنیا میں پیش بھی کیا۔ فیل میں ہم فاشٹزم کے ان دو بڑے علمبرداروں کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ ان کے بنیادی تصورات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس سلسلہ میں مسوئینی کا اثر شادیہ ہے:-

”نسطائیت فکر بھی ہے اور عمل بھی۔ یہ تحریک بعض خاص قسم کے اداروں کو تخلیق کرنے کے لیے

معروض وجود میں نہیں آئی، بلکہ یہ انسانی کی روحانی زندگی کی معلوم بھی ہے۔ یہ اس کی داخلی اور خارجی زندگی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کا غم رکھتی ہے، اس کے پیش نظر انسان، اس کے اخلاق اور اعتقادات کو بدلتا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے یہ قوت کے استعمال کو بالکل جائز سمجھتی

ہے۔ یہ انسان کی روح میں داخل ہو کر اس پر بلا شرکت غیر فرمانروائی کرتی ہے۔“

اسی طرح وہ اس فکری تحریک کے عالمگیر پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

”فاشٹزم ایک تصور، ایک عقیدہ اور ایک آفاقی تحریک ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اپنے اداروں کی

ہدایت کے نقطہ نظر سے اطلاوی معلوم ہو، مگر روح کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ اس کے علاوہ

آخر اس کا مزاج ہو بھی کیا سکتا ہے۔“

ہٹلر نے بھی قریب قریب اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

”قومی اشتمالیت ایک ایسا عقیدہ ہے جو خون، رنگ، نسل اور شخصیت کی اہمیت کو اجاڑتا

ہے اور انتخاب طبعی کے ابدی قوانین کی اثر آفرینی کو واضح کرتا ہے۔“

فاشٹزم پر کسی قسم کی تفصیلی گفتگو کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان مفکرین کی نشان دہی کریں

جن کے خیالات نے اس تحریک کو جنم دیا۔ اس سلسلہ میں جو بات ذرا کھل کر ہمارے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ میکیاوولی، شوپن ہار، نیٹشے، رینان، نیلٹی، جارج سورل، ولیم جیمز، پرگسان، ہابز اور لاک کے خیالات نے اسے جنم دیا، اور لوٹھر، کانٹ، ہیگل، فٹشے، فریڈرک لٹ کے تصورات نے اسے قومی اشتمالیت

(NATIONAL SOCIALISM) کا جامہ پہنایا، اور ہٹلر اور مسوئینی کی بے پناہ قوت اور ہڈ پٹنے

اسے دنیا میں سر بلندی عطا کی۔

اس تحریک کی بنیاد جن تصورات پر رکھی گئی ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم ریاست کی ہمہ گیری کا دعویٰ ہے۔ مسوینی اس کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”زندگی کے فسطائی نقطہ میں ریاست کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک فرد کے

وجود کو اسی مذہب تسلیم کرتا ہے جب تک کہ اس کا مفاد ریاست کے مفاد سے ہم آہنگ ہو۔

ہمارے اس نظام فکر میں ریاست ہمہ گیر ہے۔ اس سے ہٹ کر نہ کسی انسانی یا روحانی تصور کو

مانا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ جو کچھ بھی دنیا میں موجود ہے وہ ریاست

میں ہے، اس سے باہر یا اس کے خلاف دنیا میں کسی دوسری چیز کا وجود نہیں۔“

اس طرز خیال کا آغاز نہ معلوم کس دور میں ہوا، مگر اسے علمی حیثیت سے یابز نے پیش کیا۔ اس کا

گمان یہ تھا کہ مملکتی زندگی کے قیام سے پہلے جب انسان حالت فطری میں زندگی بسر کر رہا تھا تو اس کی زندگی

اس درجہ غیر محفوظ، انتشار انگیز اور وحشت افزا تھی کہ وہ اپنی بقا، اور امن و عافیت کے لیے یہ سودا کرنے

پر مجبور ہو گیا کہ اپنی جان کو بچانے کے لیے وہ نہایت ہی خوش دلی سے اپنی آزادی اور اپنے اختیارات کو

ایک فرمانروا کے سپرد کر دے، اور اس کی غیر مشروط اطاعت بجالائے۔ ایک خود مختار فرمانروا کے سامنے

سر بسجود ہو جانے کے بعد، اب کسی شخص کا یہ حق نہیں کہ وہ اس پر کسی قسم کا اعتراض کرے، یا اس کے کسی حکم

کی خلاف ورزی کرے۔

تھوٹر سے اختلاف کے ساتھ لاک (LOCKE) نے بھی یہی نظریہ پیش کیا، البتہ اس نے اس بات

پر زور دیا کہ یہ معاہدہ جہاں ایک طرف افراد کے مابین طے پاتا ہے، تو دوسری طرف فرد اور فرمانروا کے

مابین طے بھی متعین کرتا ہے، یعنی فرمانروا اس معاہدہ کا ایک فریق ہے اور اس کی اطاعت و فرمانروائی

اس شرط پر مبنی ہے کہ وہ امن قائم کرے۔

روسو نے معاہدہ عمرانی کے نظریہ کو ایک اور شکل میں پیش کیا۔ وہ حالت فطری کو انسان کی مثالی

حالت تصور کرتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کا یہ فطری انداز ترک کر کے مملکتی زندگی

کا قلاوہ اس وجہ سے نہیں پہنکا کہ وہ امن و عافیت سے محروم تھا۔ بلکہ آزادی کے بدلے غلامی کو اختیار کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ ابن آدم اپنی فطری کمزوریوں کے باعث اس پر مسرت اور پُر امن زندگی کو دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور مملکت کے قیام پر مجبور ہوا۔ دوسرے نزدیک معاہدہ عمرانی افراد کے مابین طے پاتا ہے جس کے ذریعہ سب افراد اپنی آزادیوں کو ارادہ عامہ (GENERAL WILL) کے تابع کر دیتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق فرمانروا خواہ وہ ایک فرد ہو یا کوئی ادارہ، وہ اسی ارادہ عامہ کا مظہر ہوتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ ارادہ عامہ اکثریت کی رائے یا تمام افراد کی رائے سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اس میں کچھ آسانی خصوصیات شامل ہو کر اسے بالکل منفرہ عن الخطا بنادیتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس "ارادہ عامہ" کو سمجھنے کا کسے اشتقاق ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ایک فرمانروا ہی اس کی اہمیت رکھتا ہے، وہی اس قابل ہے کہ اپنی ذہانت و مطابعت سے "ارادہ عامہ" کے "خاموش اشاروں" کو جان کر عوام کو نہ صرف اُن سے مطلع کرے بلکہ انہیں قوت کے ساتھ ان کا پابند بھی بنائے کیونکہ کسی فرد یا سوسائٹی کا جو فکر و عمل بھی اس سے ہٹ کر ہو گا وہ یقیناً گمراہی کی طرف بے جاٹے گا۔ دوسرے الفاظ میں آپ اس نظریہ کو یوں سمجھیے کہ ایک فرمانروا ہی صحیح بات کہنے کا مجاز ہے، افراد کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ وہ بالکل آنکھیں بند کر کے اس کے احکام کو مانتے چلے جائیں۔ وہ انسانوں کے اس بے زبان گلہ کو جیسے سماج یا سوسائٹی کہا جاتا ہے، میکائی طور پر اپنے قوت و اقتدار سے جبر چاہے بانگتا پھرے۔ دنیا کی کسی قوت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے "الہامی پروگرام" میں دخل ہو۔

پھر فرمانروا کے اس سارے غیر معقول طرزِ عمل کو جو سرسراہٹ باطل افکار پر مبنی ہے، ریاست کے منافع عمومی کے نام پر جائز اور برحق قرار دیا جاتا ہے۔ انسان کے ذہن میں سب سے پہلے اس غلط تصور کو بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ "فرد قائم ربطیت سے ہے تنہا کچھ نہیں" اس لیے ہر وہ چیز جو ربطیت میں شامل ہو وہ سرسراہٹ باطل ہے۔ لہذا ریاست کے سارے ہی خواہشوں کا فرض ہے کہ وہ ہر قیمت

پراس کا استیصال کریں۔ ایک انسان کی حیثیت سماج کے نامیہ میں ایک خلیہ (CELL) کی سی ہے۔ ریاست کی غیر مشروط خدمت اور چاکری میں ہی اس کی آزادی ہے۔ جو شخص اپنے رجحانات کو ریاست کے طرز عمل کے مطابق نہیں ڈھالتا وہ ملک و ملت کا دشمن ہے اور اُسے جتنی جلدی دنیا سے ختم کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ ایک فرد کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہی یہی ہونا چاہیے کہ وہ مملکت کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا دے، اپنی تمام خواہشوں، آرزوؤں اور عزائم کو اس کی مشیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ اس کا جینا اور مرنا اسی کی خاطر ہو، اُس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی کے لیے وقف ہو وہ اگر مانگے تو اسی سے مانگے، اور جھکے تو اسی کے آگے جھکے۔

اس تصور کی رو سے مملکت کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں، بلکہ مقصود بالذات ہے۔ یہ محض اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر نہیں، بلکہ اس میں الوہیت کی صفات بھی موجود ہیں۔ لہذا انسان کی نہ صرف مادی فلاح اس کی اطاعت کیشی پر منحصر ہے، بلکہ اُس کی روحانی سر بلندی بھی اُس کی پریشش سے وابستہ ہے۔

مملکت کو انرلی اور بادی اور واجب بالذات قرار دینے کا لازمی نتیجہ ہے کہ اُسے نہ صرف ہر قسم کی قیود سے آزاد سمجھا جائے بلکہ یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ تمام قسم کی اخلاقی اور معاشرتی پابندیاں عائد کرنے کا غیر محدود حق اسے — اور تنہا اسے — حاصل ہے۔ تمام اصول اور قوانین کا واحد سرچشمہ صرف وہی ہے۔ وہ جن جن طریقوں سے بھی اپنے بقا و استحکام کے لیے کوشش کرے وہ جائز اور مبنی برانصاف ہیں۔ ان پر کسی قسم کی حرف گیری نہ ہونی چاہیے بلکہ عوام کو انہیں ہی راستی اور عدل کا اصل معیار سمجھنا چاہیے اس لحاظ سے مذہب و اخلاق سے اگر یہ مقاصد حاصل ہوں تو انہیں اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر یہ اس راستے میں مراعہ ہوں تو انہیں یکسر چھوڑ دینا چاہیے۔

ہیگل نے اپنی کتاب فلسفہ تاریخ میں ان افکار کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ”ریاست اس سرزمین پر ایک الہامی تصور ہے، ایک فرد میں جو صلاحیت بھی پائی جاتی ہے اُس کی جو قدر قیمت بھی ہے وہ صرف اسی کی وجہ سے ہے۔ ریاست مقصود بالذات ہے۔“

اسی کا حق سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ ایک فرد کا سب سے اولین اور بڑا فرض۔ ریاست کی رکنیت اختیار کرنا ہے۔“

مسوینی نے اسی نظریہ کی تائید میں کہا ہے :-

”دفاثرم ریاست کو افراد اور گروہوں کے مفاد میں بالکل مطلق العنان تصور کرتا ہے فطائی ریاست ارادہ اور اختیار رکھنے والی ایک باشعور شخصیت ہے۔ اسے ایک اخلاقی ریاست سمجھنا چاہیے جو اپنے اندر اخلاقی اور روحانی پہلو بھی رکھتی ہے۔“

قومی ریاست کا یہ نظریاتی ارتقاء جہاں چند اصحاب فکر کی ذہنی کاموشوں کا نتیجہ ہے وہاں یہ چند تاریخی واقعات کا زمین منت بھی ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد جب نپولین کی شہنشاہیت قائم ہوئی اور فرانسیسی فوجیں یورپ کی سرزمین پر سیلاب کی موجوں کی طرح پھیل گئیں تو اس سیل بے پناہ کو روکنے کے لیے مختلف اقوام کے اندر ایک جذبہ بیدار ہوا جس سے سیاسی دنیا اس وقت تک نا آشنا تھی۔ یہ قومیت کا جذبہ تھا۔ جب غیرت و حمیت نے اس پر تازیانہ کا کام کیا تو اس نے سیاسی نظریات و افکار میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ ریاست اب تک ایک تصور تھی جسے اصولاً چاہیے جتنی اہمیت دی جاتی ہو مگر عملاً لوگ اس کی ہستی کو فرضی سمجھتے تھے، اور وہ اصل چیز حکومت کو تصور کرتے تھے، کیونکہ یہ اُن کے سامنے بیکہ محسوس کی شکل میں جلوہ گر تھی، وہ اُن کی زندگیوں پر نہایت گہرے طور پر اثر انداز تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ریاست کے بارے میں بھی وہی رائے قائم کر لیتے جو حکومت کے بارے میں رکھتے تھے، مگر بے نا (JENA) کے میدان میں پریشیا کی شکست اور اس کے بعد نپولین کے جرمنی پر بالکل حادی ہو جانے کا سیاست اور سیاسی ذہنیت پر وہ اثر پڑا جو یورپ کے تمام فلاسفہ کی قیل و قال اور انقلاب کی ساری کشمکش کو نصیب نہ ہوا تھا۔ قومیت کے جذبے نے صرف جرمنی کو نپولین کے ظلم سے آزاد نہیں کیا بلکہ معاشرے میں ربط اور سیاسی فلسفے میں معنی پیدا کرنے کا ایک بہت اچھا ذریعہ فراہم کر دیا۔ لہٰذا جرمنی کو اتحاد اور اثبات پر آمادہ اسی عقیدے نے کیا کہ وہ ایک قوم ہیں، ان کی ایک خاص تہذیب ہے، اس تہذیب کی حفاظت کرنا اور قوم کی عزت قائم رکھنا اُن کا سب سے بڑا

فرض ہے اور یہ فرض صرف ریاست سرانجام دے سکتی ہے۔ اسی طرح قومیت کے احساس اور تہذیب کے قدردانوں نے جرمنی قوم کو ریاست کے استحکام اور اس کی قوت اور اقتدار کو حتی الامکان بڑھانے کی مصلحت سمجھاٹی۔ رفتہ رفتہ جرمنوں کی ایک خاصی بڑی جماعت کو پروشیا کی سلطنت سے وہ گہرا روحانی اخلاقی اور تہذیبی تعلق ہو گیا جو فلسفے کی رو سے ایک سچے شہری کو اپنی ریاست سے ہونا چاہیے، اور ریاست کے عینی تصور نے، جو زیادہ سے زیادہ ایک فلسفیانہ حقیقت تھا، ایک واقعی ریاست کی شکل اختیار کر لی۔

یہی وہ دور تھا جس میں انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے بڑی بڑی مشینیں چلائی شروع کیں۔ اس سے پیداوار میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ مگر یہ "ترقی" سر اپا رحمت نہ تھی بلکہ اس نے مختلف قوموں اور ملکوں کے سامنے بے شمار پیچیدہ مسائل کھڑے کر دیئے۔ وہ قومیں جو اس صنعتی انقلاب کی دور میں لگے تھیں وہ کچھ مدت کے لیے تو دنیا کی دولت بے خطر سمیٹتی رہیں، مگر جلد ہی ان کے حریف پیدا ہو گئے اور اس میدان میں مسابقت کا دور شروع ہوا۔ ظاہر بات ہے کہ شکار گاہوں کی تلاش کچھ آسان کام نہ تھا، اس کے لیے بڑے بڑے معرکے ہوئے تب کہیں جا کر طاقتور شکار یوں کو اطمینان اور چین سے شکار کرنے کا موقع ملا۔

یہ مہمات اسی صورت میں سر کی جاسکتی تھیں جب ملک کے اندر اتحاد اور یک جہتی ہو، جب ایک ہی جذبہ ساری قوم کو متحرک کر دے، اور ملک کے سارے باشندے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بلا چوں پورا ان بڑے بڑے اور کہنہ مشق "شکاریوں" کے حملے کر دیں۔ اسی جذبے نے ملک میں فسطائی رجحانات کو تقویت دی، اور پوری کی پوری قوم میں بلا سوچے سمجھے ایک فرو یا گہ وہ کی پیروی میں دوسروں پر ٹوٹ پڑیں۔

دوسری طرف جب کمزور اقوام نے یہ دیکھا کہ ان کی زندگی پر آبنی ہے تو انہوں نے بھی اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے اپنے گروہ قومیت کی دیواریں کھڑی کر دیں، اور ان کے پیچھے پناہ ڈھونڈی۔ بیرونی خطرات نے ان سب کو

ایک مرکز پر جمع کر دیا اور وہ متحد ہو کر دشمن کے خلاف صف آرا ہوئیں۔

انسانی ذہن کبھی خلائیں کام نہیں کرتا۔ اس کے لیے کوئی نہ کوئی اساس ضرور ہونی چاہیے۔ اُسے اگر ایجابی محرکات مہیا نہ ہوں تو وہ سبھی جذبوں سے کام لیتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت ہمیں قومی ریاست میں ملتا ہے۔ کلیسا اور مذہب کی شکست کے بعد مغربی ذہن نے کچھ اس قسم کے محرکات کو جنم دینے کا غم کیا جن سے اُس کی زندگی کا عمل جاری رہ سکے۔ اسی کے نتیجے میں حق پرستی کو چھوڑ کر قومیت پرستی کو ایک دین کی حیثیت سے اختیار کیا گیا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قومیت ایک قسم کا نفسیاتی احساس ہے جسے نہایت ہی غلط اور جھوٹے طریقے سے روحانی احساس کی جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر جس طرح دین انسان کے اس روحانی جذبہ کو ایک محسوس شکل میں متشکل کرتا ہے، اسی طرح ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ احساس قومی کو عملی جامہ پہنلائے۔ اس نقطہ نظر سے مملکت اب ایک ایسی تنظیم بن گئی ہے جو ایک طرف تو قوم کے ارادہ اور منشا کا مظہر ہوتی ہے اور دوسری طرف اُس کی اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی محرک۔ ممکنہ نظم و نسق کی وحدت اور معاشی مفاد کی یکسانیت سے قومیت کے جذبہ کو نشوونما پانے کا پورا موقع ملتا ہے جسے دوسری اقوام سے معاشی مقابلہ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح یہ جذبہ ایجابی اور سلبی طور پر موجودہ دور کے قوم پرست انسان کو سرگرم عمل کر رہا ہے۔ اس کی حیثیت آج وہی ہے جو آج سے چند سو سال پہلے دین، اخلاق کی تھی، آج انسان اس نئے بت کے سامنے اسی طرح سر بسجود ہیں جس طرح کہ کبھی وہ ایک بلند و بالا ترستی کے سامنے پھٹتے تھے۔

فکرِ انساں بت پرستے، بت گردے

ہر زمانہ بدستجوئے پیکرے

باز طرح آفریں انداخت است

تازہ تر پروردگار سے ساخت است

کاید از خوں ریختن اندر طرب

نام اورنگ است و ہم ملک و نسب